جہنم کے سوداگر

The Traders of Hell

تحریر محمد جبران
(ایم فل اسکالر)

راوی وقار علی جان

قسط ۲۱

ڈیوڈ کی رہائی

اختتامیہ

شیطان کی موت

نوٹ: جہنم کے سوداگر کی ہر قسط صرف پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر لگائی جائے گی۔

ڈیوڈ کی رہائی (قسط 21:)

جیریکو مور کا نام کسی سے ڈھکا چھپا نہیں تھا، وہ ایک عالمی شہرت یافتہ امریکی سیاح تھا۔اس کی سیاحت کے قصے پوری دنیا میں مشہور تھے۔ وہ دنیا کے سب سے دشوار گزار علاقوں کی سیر کرتا تھااور پھر انہی میں پیش آنے والے دلچسپ و عجیب واقعات کا تفصیلی خاکہ اپنی کتابوں میں لکھ دیتا تھا۔وہ کتابیں دنیا کی کئی زبانوں میں شائع ہوتی تھیں جسے خوب پذیرائی ملتی تھی۔ افریقہ سے لیکر سائبریا کے برفیلے پہاڑوں تک اس نے ہر جگہ طبائع آزمائی کی تھی اور پھر انہیں خوب مرچ مصالحہ لگا کر اپنی کتابوں میں لکھتا تھا۔اس کی شہرت اس قدر تھی کہ دنیا بھر میں اس کے مداح موجود تھے جو اپنی محبتوں کا اظہار خطوط کے ذریعے اکثر کرتے رہتے تھے۔ سیاحت کی دنیا میں اسکا نام ایک سند کی حیثیت رکھتا تھا۔اس کے قصے پڑھ کر کئی نوجوان متاثر ہو کر اس فیلڈ میں آرہے تھے اور انہیں بھی دنیا ایکسپلور کرنے کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔یہ دنیا میں ریکو کے نام سے مشہور تھا اور ایڈونچرز آف ریکو کے عنوان سے کتابیں تحریر کرتا تھا۔

اپنے ٹرائل میں اس کا نام اور حوالہ میں نے خوب سوچ سمجھ کر دیا تھا۔ کرنل اشر سے لیکر اپنے ہیڈ کوارٹر تک میرا براہ راست کسی سے کوئی تعلق واسطہ نہیں تھا۔ مگر میڈیا کو دیکھ کر میں نے اپنا ریڈی میٹ پلان تیار کر لیا تھا۔ میں ایرانی نفسیات سے بخوبی واقف تھا، وہ امریکا کو بدنام کرنے اور اسے زچ کرنے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ تاکہ عالمی برادری میں سعودی عرب اور اسکے دیگر دوست یورپی ممالک کے مقابلے میں طاقت کا توازن برقرار رکھا جاسکے۔ اس کا اظہار وہ ماضی میں بارہا کرتے رہے تھے۔ اپنی اسی خارجہ پالیسی کے اظہار کے لئے مجھے پورا یقین تھا کہ وہ میرے ٹرائل کا بھرپور ڈھول پیٹیں گے۔ اسی لئے میں نے سوچ لیا تھا انکی اسی پلاننگ سے خوب فائدہ اٹھایا جائے۔ انہی کی کشتی میں سوار ہو کر پانی میں انہی کے روٹ پر اپنے سفر کی راہ ہموار کی جائے۔ اپنی کمزوری کو خود انہی کی طاقت سے اپنی طاقت میں

بدلنا تھا۔ جس کے لئے مجھے زیادہ محنت کی ضرورت نہیں تھی۔

کمرہ عدالت عام فلمی دنیا سے ہٹ کر ضرور تھا مگر عدالتی اصولوں کے عین مترادف میری کوریج لائیو ہو رہی تھی۔ وہاں ملکی اور غیر ملکی میڈیا کے نمائندے موجود تھے۔ لہذا کرنل اشر سے رابطے کا یہ بہترین طریقہ تھا۔ فردوسی اسٹریٹ میں ہاؤس نمبر تھرٹی سیون سے توقیر رضوی کو پیدا کرنا بلیک ڈائمنڈ ایجنسی کے لئے الٹے ہاتھ کا کام تھا۔ البتہ مجھے جیریکو مور کا بیٹا برائن مور ثابت کرنے کے لئے انہیں تھوڑی سی محنت ضرور کرنی پڑنی تھی۔ کیوں کہ میرے پاسپورٹ اور توقیر رضوی کے ساتھ میرے تعلق کو جوڑنا اور پھر اسے کاغذات کی شکل میں ڈھالنا ایک کٹھن کام تھا مگر ناممکن نہیں۔ وہ اس لئے کہ یہ کام تو بلیک ڈائمنڈ ایجنسی کے لئے روز مرہ کا تھا، کیونکہ انکی مہارت ہی یہی تھی۔۔ البتہ اتنے کم عرصے میں یہ سب کرنا یہ یقیناً ایک چیلنج تھا۔

فردوسی اسٹریٹ میں ہاؤس نمبر تھرٹی سیون انہی کا ہی پوائنٹ تھا، جو نقشہ مجھے مورس نے دیا تھا اس میں جگہ جگہ ہمارے پوائنٹس کی نشاندہی پہلے سے ہی کی ہوئی تھی۔ اسی نکتے کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں توقیر رضوی کے ایک فرضی کردار کو عدالت کے سامنے لایا تھا۔ اسے وہاں سے برآمد کروا کر عدالت میں پیش کرنے تک مجھے تھوڑا سا وقت مل جاتا۔ وقت بہت کم تھا اس لئے بہت قیمتی تھا اور انہی نکتوں کو آپس میں جوڑ کر وقت کو اپنے حق میں استعمال کرنا ہی اصل آرٹ تھا۔

ایران کی امریکا کے حوالے سے عدالتی تاریخ ایک بھیانک خواب سے کم نہیں تھی۔ زیادہ تر ٹرائل ون سائیڈ ڈ ہی رہے تھے اور پھانسیوں پر ہی ختم ہوتے تھے۔ مگر میں جس وقت کے حالات بیان کر رہا ہوں وہ نائن الیون سے قبل کے ہیں۔ اس دور میں ائیرپورٹس پر اتنی سختی نہیں ہوتی تھی جتنی اب ہے۔ میری برائن مور والی نئی شناخت کو پاسپورٹ وغیرہ میں پیدا کرنا اور میری فلائٹس کا ریکارڈ ظاہر کرنا مشکل نہیں تھا یہی وجہ تھی کہ میں عدالت میں پر اعتماد تھا اور مجھے امید تھی کہ ایرانی سسٹم میں موجود لوپ ہولز کو اپنے حق میں استعمال کیا جا سکتا تھا۔ اسی صورت میں میری عدالت سے رخصتی ہونے کا ایک معمولی سا چانس تھا۔

اب اسے ایرانیوں کی ایک اور حماقت کہیں یا میرے شاطر دماغ کی اختراع یا میرے رب کا مجھ پر ایک اور کرم۔ جو بھی تھا مجھے اندھیرے میں ہلکی سی روشنی کی کرن ضرور دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے اپنا پتہ پھینک دیا تھا اور اب اس پتے کا ری ایکشن دیکھنا تھا۔ ایک جاسوس اپنا سارا مقدر قسمت اور دعاؤں کے سہارے نہیں چھوڑ سکتا۔ حرکت میں برکت کے مصداق مجھے مسلسل اپنے لئے سوچتے اور حرکت کرتے رہنا تھا۔

ایک جاسوس محض چالاک ہو کر اور مارشل آرٹس کے چند کرتب دکھا کر کامیاب نہیں ہو سکتا۔اسے عالمی سیاست سے لیکر خارجہ پالیسی تک اور عام انسانی نفسیات سے لیکر بین الاقوامی ممالک کی نفسیات تک سب کی مکمل نالج ہونی چاہیے ۔یہاں تک کہ اسے دنیا بھر میں رائج عدالتی ڈھانچوں کے تمام میکانزم کے بارے میں علم ہونا چاہیے، کیونکہ وہ میری طرح کسی بھی ملک کی حکومتی مشینری کے چنگل میں کبھی بھی پھنس سکتا ہے۔میں ایک عام جاسوس نہیں، بلکہ مجھ پر اب تک کروڑوں اربوں ڈالرز لگ چکے تھے۔اس سب کچھ کو ذہن میں رکھتے ہوئے مجھے توقع کے عین مطابق عدالت میں وہی کرنا چاہیے تھا جو میں نے کیا۔

مجھے عدالت سے سیدھا ایک گاڑی میں ڈال کر کہیں دور دراز ایک کال کوٹھری میں لایا گیا تھا۔میری آنکھوں سے پٹی اتار دی گئی تھی البتہ میرے ہاتھ اور پاؤں اب بھی بندھے ہوئے تھے۔مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں اب کہاں ہوں اور آئندہ میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔وقت نے اپنی رفتار دھیمی کرلی تھی گویا ہر لحہ گھنٹوں پر محیط تھا۔ایسے میں، میں نے خود کو آہستہ آہستہ سیدھا کیا اور کوشش کرنے لگا کہ اندھیرے میں کچھ دیکھ پاؤں مگر بہت کوشش کے باوجود ایسا کرنے میں ناکام رہا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

اس جگہ پر عجیب سی انسانی لاشوں اور انسانی خون کی بدبو پھیلی ہوئی تھی۔پھر انہی بدبوؤں میں رفتہ رفتہ گندے نالے کی بدبو کا بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ان تینوں کے ملاپ نے عجیب و غریب ماحول کو جنم دینا شروع کر دیا تھا۔جسمانی ٹارچر تو تا حال مجھ پر خاطر خواہ نہیں ہوا تھا البتہ ذہنی ٹارچر نے مجھے آہستہ آہستہ اپنی گرفت میں لینا شروع کر دیا تھا۔اس ماحول میں ایک عام آدمی کا گزارہ کرنا تقریباً ناممکن تھا مگر مجھے اس سے سمجھوتا کرنا تھا۔مجھے اپنے ذہن کو اپنے کنٹرول میں رکھنا تھا تاکہ میں آئندہ پیش آنے والے حالات پر گہری نگاہ رکھ سکوں۔یہاں تک کہ مجھے اپنے ماضی کو بھی نہیں بھولنا تھا۔

ماضی میں پیش آنے والے تمام حالات و واقعات کا ٹھنڈے دماغ سے تجزیہ کرنا بے حد ضروری تھا۔تاکہ میں اپنی غلطیوں کو دیکھ سکوں اور مستقبل میں انہیں دہرانے سے باز رہ سکوں۔آہستہ آہستہ میں نے اپنی خفیہ حسیں جگانا شروع کر دیں۔انہی کی بدولت میں اکثر ہر قسم کا ٹارچر برداشت کر لیتا تھا۔سب سے پہلے میں نے اپنی سانسوں کو روک لیا تاکہ گندی اور غلیظ بدبوؤں سے میری جان چھوٹ جائے۔اس کے بعد میں نے اپنے ذہن کو ایک خاص نکتے پر مرکوز کرتے ہوئے باقی تمام سوچوں سے خود کو آزاد کر لیا۔کچھ ہی دیر میں، میں ایسا کرنے میں کامیاب ہو گیا۔اس سب کچھ کے باوجود میں اپنے گردوپیش سے باخوبی واقف تھا۔

میں نے ایک لمبی جست لگائی اور پھر میں اپنے ماضی میں چلا گیا۔سب سے پہلے علی رضا کے روپ میں مورس جانز کی ڈرامائی انٹری نے مجھے چونکا دیا تھا۔ جس نے آمنہ جہاں کے سر پر بٹ مارا اور اسے بے ہوش کر دیا تھا۔وہ کرنل اشر کی جانب سے ایرانی سیکرٹ سروس میں پلانٹ کیا ہوا اس کا ایک مہرہ تھا۔اس نے نہ صرف مجھے آمنہ جہاں کے چنگل سے چھڑایا بلکہ اس نے ایک ایسی تیار پجارو بھی دی جس میں میک اَپ کٹ سے لیکر کپڑے بھی موجود تھے۔میرے اصرار کے باوجود وہ میرے ساتھ جانے کو تیار نہیں ہوا تھا بلکہ یہ کہہ کر چلا گیا تھا کہ اس نے آمنہ جہاں کو ٹھکانے لگانا ہے۔اس کے بعد آمنہ جہاں کے ساتھ کیا ہوا؟ وہ اس وقت کس حال میں تھی اس کا ماموں کیسی حالت میں تھا؟

یہ تمام سوالات ابھی جواب طلب تھے۔خود مورس کہاں تھا مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا۔اسی کے بقول میرا تعارف بلیک ڈائمنڈ ایجنسی کے ایک اور مقامی ایجنٹ کیون اوبرا سے ہوا تھا اور اسی نے مشورہ دیا تھا کہ میں براہ راست بلیک ڈائمنڈ ایجنسی کے سیکرٹ پوائنٹ پر جانے کے بجائے وہاں سے سیدھا شہر سے باہر جاکر ایک پبلک فون بوتھ پر اس سے ملوں وہی سیف جگہ ہوگی۔اس نے ایسا مشورہ کیوں دیا تھا؟ جبکہ میں وہاں سے سیدھا ایجنسی کے خفیہ پوائنٹ پر بھی جاسکتا تھا اور اگر ایسا ہوتا تو میرے اس ملک سے نکلنے کی راہ ہموار ہو جانی تھی۔ مگر اس کے بعد سب کچھ اس کے برعکس ہوا تھا۔کیوں اور کیسے؟

اب تک جو کچھ ہوا اور میں اس نہج تک پہنچا تو کیا اس سب کا ذمہ دار مورس تھا؟ مگر بظاہر وہ تو میرا خیر خواہ تھا اس نے مجھے اتنی عزت دی، اس قدر مدد کی تو پھر ڈیوڈ آن ٹرائل کیسے ہوا؟۔۔۔اگر وقتی طور پر یہ مان لیا جائے کہ وہ میرا خیر خواہ تھا تو پھر میرے حالات کا اصل ذمہ دار کون ہے؟ اس کے خیر خواہ ہونے کا بھرم تب تک قائم تھا جب تک مجھے آمنہ جہاں کی موجودہ سچوئیشن کا علم نہیں ہو جاتا۔

اس کا دوسرا پہلو مجھے خود کٹہرے میں لا کھڑا کرتا ہے۔میں نے مورس پر اس قدر بھروسہ کیا، اس نے جو کہا میں نے ویسے عمل کیا آخر کیوں؟ میں نے خود کیوں نہیں سوچا؟ اور اگر یہ ٹریپ خود اسی نے بچھایا تھا تو مجھے اس سے بچنا چاہیے تھا۔بہر حال وہ ایجنسی کا مقامی چھوٹا سا کارندہ ہے اس کے اسٹیٹس میں اور میرے اسٹیٹس میں زمین آسمان کا فرق ہے۔اسے مجھے ہر صورت میں ملحوظ رکھنا چاہیے تھا، یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ ایرانی سیکرٹ سروس کا ایجنٹ علی رضا ہی ہو اور ڈبل کراس کر رہا ہو؟ اندھا اور بغیر احتیاط کے ہر کسی پر اعتماد کرنا ہماری فیلڈ میں ہمیشہ تباہی کا موجد بنتا ہے۔

اس نے ٹریپ کیا یا میں ٹریپ ہوا، کان یہاں سے پکڑیں یا ہاتھ گھما کر دوسری طرف سے پھنسا تو آخر میں ہی ۔۔۔کیون اوبرا!! یہ نام بار بار میرے ذہن میں کھٹکنے لگا۔اس نے راستے میں ہی ایجنسی کے مقامی پوائنٹ جانے کی بجائے

اپنے فارم ہاؤس جانے کا مشورہ دیا اور نہ صرف مشورہ دیا بلکہ اس پر عمل بھی کرڈالا۔ تو کیا ساری گیم یہاں سے پلٹی ؟ بقول اس کے، اس کا فارم ہاؤس ایجنسی کے خفیہ پوائنٹ سے زیادہ محفوظ تھا۔ جو کہ ہو نہیں سکتا کیونکہ عام حالات میں ایجنسی کو خفیہ اور کارگر رکھنے کے لئے اس کے مقامی ہیڈ کواٹر کو زیادہ محفوظ رکھا جاتا ہے۔ تاکہ وہ حکومت اور اس کی مشینری سے چھپ کر زیادہ بہتر اور فعال انداز میں کام کرسکے اگر یہ بات عام حالات میں درست ہے تو پھر مجھے اس وقت وہیں ہونا چاہیے تھا مگر میں اب اس کال کوٹھری میں تھا۔

ان سب حالات کی سب سے پہلی اور اہم ذمہ داری مجھ پر آتی ہے۔ جب مجھے یہ معلوم ہوچکا تھا کہ ایرانی سیکرٹ سروس میرے پیچھے لگ چکی ہے تو مجھے حالات کو دیکھ کر پھونک پھونک کر قدم رکھنا چاہیے تھا۔ جیسے میری ایجنسی اس قدر فعال ہے ویسے یہ ایرانی سیکرٹ سروس بھی اتنی ہی فعال ہوسکتی ہے۔ میں آرام سے بیٹھ کر خود کو بلیک ڈائمنڈ ایجنسی کے مقامی ایجنٹس کے سپرد کرکے سارا تماشہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ بھی ایک پرائے ملک میں آکر۔ جیسے میری ایجنسی ایرانی سیکرٹ سروس میں جاسوس پلانٹ کرسکتی ہے تو یہی کام ایرانی سیکرٹ سروس بلیک ڈائمنڈ ایجنسی کے ساتھ بھی کرسکتی ہے۔

اب تک کے تجزیے سے مجھے یہی سیکھ ملی تھی کہ میں بلیک ڈائمنڈ ایجنسی کو استعمال ضرور کرسکتا ہوں مگر اس پر مکمل بھروسہ نہیں۔ کیون اوبرا کا کردار تو ان تمام حالات سے مشکوک ہوچکا تھا اور اب مجھے علی رضا یا مورس سے زیادہ اس پر شک تھا۔ کیونکہ جیسے ہی میں اس کے فارم ہاؤس پر پہنچا تو مجھ پر حملہ کرکے مجھے دبوچ لیا گیا۔ ایسا ہو نہیں سکتا تھا کہ کافارم ہاؤس بلیک ڈائمنڈ کے مقامی ہیڈ کواٹر سے زیادہ محفوظ جگہ ہو مگر وہاں پہنچتے ہی میرے ساتھ ہاتھ ہوگیا۔

یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ یہ سب کچھ مجھے ٹریپ کرنے کے لیے ایرانی سیکرٹ سروس کا ماسٹر پلان ہو۔ یہ سارے Chain of Events ایک دوسرے کے ساتھ کڑی در کڑی آپس میں جڑے ہوئے ہوں۔ علی رضا عرف مورس سے لیکر کیون اوبرا تک سارے ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوں۔ پر اگر ایسا ہے تو پھر آمنہ جہاں اس سارے معاملے میں کہاں اسٹینڈ کرتی ہے ؟ یہ واقعی بہت بڑا سوال تھا کیونکہ اگر ان حالات کو اس زاویے سے دیکھا جائے تو آمنہ جہاں کی خود اپنی پوزیشن اس سارے معاملے میں خراب ہوجاتی ہے۔ کہیں خود ایرانی سیکرٹ سروس میں تو ڈبل گیم نہیں ہورہی؟

یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ جس طرح آمنہ جہاں نے میرے معاملے کو ہینڈل کیا اس سے اس کی اپنی سیکرٹ سروس والے ہی خوش نہ ہوں۔ لہذا انہوں نے آمنہ جہاں سے جان چھڑانے کے لئے یہ سب کیا ہو۔ اس کے بعد مجھے تھوڑی سی ڈھیل دے کر پھر دوبارہ پکڑ لیا۔ اگر یہ سب صحیح تھا تو آمنہ جہاں کا مستقبل مجھے دوبارہ اس سیکرٹ سروس میں کوئی روشن نظر نہیں آرہا تھا۔

اس سارے عرصے میں میرا ایک بار رابطہ کرنل اشر سے ہوا تھا اور وہ بھی اسی فون سے جو علی رضا عرف مورس نے دیا تھا۔میں اب قارئین کی سہولت کے لئے اسے دونوں catagories میں ہی رکھوں گا، کیونکہ جب تک اس کا کردار واضح نہیں ہو جاتا میں علی رضا عرف مورس کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم نہیں کر سکتا۔کرنل اشر یقیناً میرے اس وقت کے تازہ حالات سے واقف نہیں تھا سوائے اس کے کہ میرا ٹرائل ہو رہا ہے اور میں ایرانی سیکرٹ سروس کو چکما دے کر نکل چکا ہوں۔البتہ اس نے یہ وعدہ ضرور کیا تھا کہ وہ میرے نکلنے کا بندوبست ضرور کرے گا۔

اگر میری یہ تھیوری مان لی جائے کہ واقعی یہ سب کچھ پری پلان تھا اور محض مجھے آمنہ جہاں کے چنگل سے نکالنا مقصود تھا تاکہ مجھے واپس سیکرٹ سروس کی کسٹڈی میں لیا جائے تو اس اعتبار سے کرنل اشر اور بلیک ڈائمنڈ ایجنسی کی ابھی تک انٹری ہوئی ہی نہیں تھی۔اس حساب سے علی رضا عرف مورس نے مجھے جو نقشہ دیا تھا اور اس پہ جو بلیک ڈائمنڈ ایجنسی کے خفیہ پوائنٹس درج تھے وہ سب جعلی ہونگے۔سوائے کرنل اشر کے نمبر کے جو مجھے زبانی یاد تھا۔تو اگر وہ سب جعلی تھے تو میری آج عدالت میں ہونے والی تمام کاروائی کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہ جاتی۔مگر اس سے ایک اور پہلو واضح ہوتا ہے کہ آمنہ جہاں کے بھائی حسام جہاں کے قتل کا محض بہانا بنا کر ایران عالمی سطح پر ڈیوڈ کا ٹرائل کر کے امریکہ کی جگ ہنسائی کرنا چاہتا ہے۔اس کا مقصد آمنہ جہاں کو انصاف نہیں دلانا بلکہ محض امریکہ کو ذلیل و رسوا کرنا ہے۔

یہ تو ہو گئی بین الاقوامی سیاست، مگر اس سب سے اب میں اپنی رہائی کیسے ممکن بناؤں؟ یہ میرے سامنے سب سے بڑا اور اہم سوال تھا۔اگر یہی گیم تھی تو اس سب سے نکلنا ہی میرا بڑا چیلنج تھا۔یہ کام میں تنہا کر نہیں سکتا تھا اس کے لئے مجھے یقیناً کرنل اشر کی مدد کی ضرورت تھی۔لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سفارتی سطح پر پاکستان ایران پر دباؤ ڈال کر مجھے یہاں سے نکلنے میں مدد دے۔کیونکہ آخرکار انہوں نے مجھ پر اتنی انوسٹمنٹ کی ہوئی تھی اور وہ نہیں چاہیں گے کہ اپنے پہلے ہی مشن میں پھانسی چڑھ جاؤں۔

جو بھی ہونا تھا وہ سب اب میرے اختیار میں نہیں تھا۔ہاں اب پاکستانی سفارت کاروں اور کرنل اشر کے شاطر دماغ کے کورٹ میں تھی۔میں مختلف زاویوں سے پردے پر کسی حد تک مکمل تصویر دیکھ پا رہا تھا۔مجھے معلوم نہیں کہ اب تک کتنا وقت بیت گیا تھا، میرے جسم پر چیونٹیاں چڑھ آئی تھیں۔انہیں شاید آج تنگ کرنے کے لئے میں ہی ملا تھا۔میں نے ایک گہرا سانس لیا تو وہی زہریلی بدبو میرے ناک کے نتھنوں سے ٹکرائی تو فوراً ہی میری آنکھ کھل گئی۔گھپ اندھیرا تھا، ہاتھ کو ہاتھ سجائی نہیں دے رہا تھا۔البتہ چیونٹیوں کے رینگنے کا باخوبی پتہ چل رہا تھا۔میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں اور میرے ہاتھ پیچھے کمر کی طرف سے بند تھے۔جبکہ مجھے قید کرنے والے جاتے ہوئے میری ٹانگوں کو بھی مضبوطی

سے باندھ گئے تھے۔

چونکے میری تھیوری کے مطابق میں نے جو کرنا تھا وہ کرلیا تھا اور اب گیم میرے ہاتھ میں نہیں تھی۔ لہٰذا مجھے اب یہاں سے نکلنے کی بھی کوئی جلدی نہیں تھی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ یہ کیس یقیناً کورٹ میں ہی سلجھ جائے گا۔ اس لئے میں اس طرف سے مطمئن ہو گیا تھا، اب مجھے کھانے اور پانی کی شدت سے طلب ہو رہی تھی۔ مجھے جب سے قیدی بنا کر رکھا گیا تھا اس وقت سے اب تک مجھے کچھ بھی کھانے پینے کو نہیں ملا تھا۔ میرے لئے برداشت کا روزہ رکھنا ہی زیادہ مناسب تھا۔ سو میں بغیر فکر کئے ایک بار پھر سے آنکھیں بند کیں اور ذہن کو مخصوص انداز میں ایک خاص نکتے پر مرکوز کرنے لگا۔ کچھ ہی دیر میں، میں نے اپنے ذہن کو لاک کر لیا۔ اب مجھے صبح جاگنا تھا اور میں چاہ رہا تھا کہ تھوڑا وقت ہی صحیح میں سو لوں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

اگلی صبح میری پیشی صبح نو بجے تھی مگر خلافِ توقع مجھے کال کوٹھری سے ساڑھے دس بجے نکالا گیا اور کوئی آدھے پونے گھنٹے میں مجھے کمرہ عدالت پہنچا دیا گیا۔ سارا رستہ حسبِ سابق میرا چہرہ سیاہ کپڑے سے مضبوطی کے ساتھ ڈھکا ہوا تھا۔ البتہ احاطہ عدالت میں داخل ہو کر انہوں نے میرے چہرے سے کپڑا ہٹا دیا اور پھر میری ٹانگیں بھی کھول دیں۔ سب سے پہلی بات جو میں نے نوٹ کی کہ آج محسن شاہ میرے ساتھ نہیں تھا اور دوسرا یہ کہ عدالت میں مجھے لیٹ لانے والی ٹائمنگ بہت اہم تھی۔ ان دو باتوں کا یقیناً براہ راست میرے کیس سے تعلق ہو سکتا تھا۔ ان دونوں باتوں سے پردہ تو یقیناً آگے چل کر ہی اٹھنا تھا۔

میری آنکھیں کھلیں تو مجھے شروع شروع میں سب کچھ دھندلا سا نظر آیا پھر رفتہ رفتہ سبھی کچھ نارمل ہو گیا۔ میں نے جب گرد پیش پر نظر دوڑائی تو مجھے وہاں کافی گہما گہمی دکھائی دی۔ وہاں ایرانی فوج اور قانون نافظ کرنے والے اداروں نے عدالت کے احاطہ اور کمرہ عدالت کو مکمل طور پر اپنے کنٹرول میں لے رکھا تھا۔ میرا کیس واقعی ہائی پروفائل تھا اور اسے یقیناً اتنی ہی اہمیت ملنی چاہیے تھی جتنی کے مل رہی تھی۔ احاطہ عدالت سے باہر بہت سے ایرانی بھی موجود تھے جنہوں نے ہاتھوں میں پلے کارڈز اٹھا رکھے تھے۔ ان پر میرے خلاف فارسی اور انگریزی دونوں زبانوں میں نعرے درج تھے۔ وہ پرزور الفاظ میں امریکی جاسوس کی سرعام پھانسی کا مطالبہ کر رہے تھے۔ انہیں بھی ٹیلی ویژن کے ذریعے سب کچھ پتہ چل چکا تھا اور وہ کافی بڑھکے ہوئے تھے۔

باہر میڈیا بے صبری سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ اس دور کا میڈیا اتنا فعال نہیں تھا جتنا کے آج ہے اور نہ ہی اس دور میں چینلز کی اس قدر ریل پیل تھی۔ کل ملا کے کوئی پانچ چھ صحافی تھے، جس میں سے دو فارن اور تین مقامی تھے۔ ایک

کے ہاتھ میں کیمرہ تھا جبکہ دوسرے کے ہاتھ میں مائیک تھا اور باقیوں کے ہاتھ میں پیڈ اور قلم تھے۔ میری تربیت اخباری نمائندوں سے دور اور پوشیدہ رہنے کی تھی مگر یہ موقع ایسا نہیں تھا کہ میں میڈیا سے کنارہ کشی اختیار کرتا۔ میں جیسے ہی گاڑی سے نیچے اترا صحافیوں نے مجھے وہاں گھیر لیا۔

"مسٹر ڈیوڈ آپ ایک امریکی جاسوس ہو آج آپکو عدالت سے پھانسی کا حکم مل جائیگا۔اس بارے میں کیا کہیں گے۔۔۔۔" ایک ایرانی صحافی نے چیختے ہوئے کہا۔

"دیکھئے میں آج بھی وہی بات دہراؤنگا جو کل میں نے عدالت میں کہی تھی۔ میرا نام برائن مور ہے اور میں عالمی شہرت یافتہ سیاح، جیریکو مور کا بیٹا ہوں۔ میں کسی ڈیوڈ کو نہیں جانتا اور نہ ہی میں کوئی جاسوس ہوں۔۔۔" میں نے اس کی تلخی کو صرف نظر کرتے ہوئے نہایت تحمل سے جواب دیا۔

"اگر آپ امریکی جاسوس نہیں ہو تو پھر آپ یہاں ایران میں حساس مقامات پر کیا کر رہے تھے؟" ایک اور صحافی نے مجھ سے چبھتا ہوا سوال کیا تو میں اسے دیکھ کر دھیرے سے مسکرایا اور پھر گویا ہوا۔

"جی میں ایران کے حساس نہیں بلکہ خوبصورت مقامات کی سیر کی غرض سے آیا تھا۔ میں جاسوس نہیں ایک سیاح ہوں اور میری رہائش توقیر ناصر صاحب کی کوٹھی میں ہے۔ مجھے پوری امید ہے کہ آج عدالت میں اس بات کی تصدیق ہو جائے گی۔"

"لگتا ہے آپ کو بہت خوش فہمی ہے۔ مسٹر! یہ امریکہ نہیں ایران ہے۔ یہاں امریکیوں کے ساتھ ایسا سلوک ہو سکتا ہے کہ اس کا آپ خواب میں بھی تصور نہیں سکتے۔ کیا آپ اس بارے میں جانتے ہیں کہ یہاں امریکی نہیں ایرانی قوانین لاگو ہوتے ہیں۔۔؟" ایک اور صحافی نے دانت پیس کر اپنی بھرپور نفرت کا اظہار کیا تو میں اس کے لہجے کی تلخی کو محسوس کر کے بے اختیار مسکرا دیا۔

"جی میں امریکی ضرور ہوں مگر یہ تاثر درست نہیں ہو گا کہ میں ایرانی قوانین کے بارے میں نہیں جانتا۔ میں ایک امن پسند شہری ہوں اور ہر ملک کے قانون کا بطور سیاح احترام کرتا ہوں۔ مجھے پوری امید ہے کہ یہاں کی سب سے بڑی عدالت مجھے ضرور انصاف دے گی۔"

"مسٹر ڈیوڈ! کیا اب تک سفارتی سطح پر آپ سے کوئی رابطہ کیا گیا؟ اگر ہاں تو ہم جان سکتے ہیں کہ ان کی جانب سے آپکو کیا یقین دہانیاں کروائی گئی ہیں؟"

"جی مجھ سے تاحال کسی نے رابطہ نہیں کیا البتہ میں عالمی برادری سے اپیل کرتا ہوں کہ میرے ساتھ انصاف

ہونا چاہیے۔ وہ اس بات کو یقینی بنائیں کہ میرے ساتھ کوئی ظلم نہ ہو جو کہ معذرت کے ساتھ اب تک ایسا ہی ہو رہا ہے۔ اب دیکھیں ناں کہ مجھے اب تک کوئی وکیل بھی نہیں دیا گیا حالانکہ یہ بات مشہور ہے کہ ایران میں سستا اور فوری انصاف ملتا ہے۔ ان تمام نامصائب حالات کے باوجود مجھے پوری امید ہے کہ امریکہ سمیت دیگر یورپی ممالک میری رہائی کے لئے ضرور کوششیں کریں گے"۔

"کل رات سے امریکی وزارتِ خارجہ کی جانب کئی بار دھمکیاں دی جاچکی ہیں۔ کیا امریکہ حسبِ دستور اپنی بدمعاشی اور غنڈا گردی سے ایران کو تنہا کرنے کی کوشش کرے گا؟ حالانکہ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ ایران ایک خدار ملک ہے وہ اپنے اصوالوں پر کبھی سودے بازی نہیں کرے گا۔۔۔"

"جی یقیناً اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایران ایک خدار ملک ہے، اس میں کوئی دو رائے نہیں البتہ امریکہ نے کیا کیا ہے اور کیا کرے گا؟ مجھے کچھ اندازہ نہیں۔ میں کل سے ایک کال کوٹھری میں بند ہوں۔ جہاں روشن دن میں بھی کچھ نظر نہیں آتا۔ سو مجھے بالکل انداز نہیں باہر کی دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔"

"آپ نے کہا کہ آپ کے ساتھ ناانصافی ہو رہی ہے، کیا آپ بتانا پسند کریں گے کہ وہ کیا ناانصافی ہے؟ کیا آپ ایرانی سیکرٹ سروس کی کارکردگی سے مطمئن نہیں ہیں؟"

"جی تاحال مجھے کوئی وکیل نہیں دیا گیا، اب تک یہ ساری ذمہ داریاں مجھے خود ہی نبھانی پڑ رہی ہیں۔ میں کل سے ایک کال کوٹھری میں بند ہوں۔ وہاں مجھے کھانا تو درکنار پانی بھی نہیں پوچھا گیا۔ جہاں ہر سُو اندھیرا ہی اندھیرا ہے اور نہ میرا رابطہ میری embassy سے ہونے دیا جا رہا ہے۔ آج میں آپ کے توسط سے یہ مطالبہ کرتا ہوں کہ مجھے انصاف دلایا جائے ورنہ عالمی برادری یہ سب دیکھ رہی ہے اسے نوٹس لینا چاہیے یہ ایک بے گناکی زندگی کا سوال ہے۔"

"آپ نے ابھی کہا کہ آپ امریکہ سمیت عالمی برادری سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ آپ کی رہائی کے لئے کوششیں کریں مزید یہ کہ آپ نے یہ بھی مطالبہ کیا کہ وہ آپ کو انصاف دلائیں۔ کیا یہ خود انصاف کے عمل میں رکاوٹ ڈالنا نہیں ہے؟ اگر آپ سچے اور کھرے ہیں اور آپکے بقول آپ سیاح ہیں نہ کہ ایک جاسوس تو آپکو اس طرح کے بیانات دے کر عدالتی عمل کو سبوتاژ نہیں کرنا چاہیے۔"

"دیکھیئے انصاف کے حصول کا اصول دنیا میں ہر کسی کو حاصل ہے اور اگر میں سمجھتا ہوں کہ اب تک میرے ساتھ ناانصافی ہو رہی ہے تو اس کا ازالہ ہونا چاہیے۔۔۔۔ کیا آپ نہیں چاہتے کہ منصفانہ ٹرائل ہو تا کہ عالمی برادری کو یہ سوال اٹھانے کا موقعہ ہی نہ ملے کہ کسی بھی قسم کی ناانصافی ہوئی ہے۔ میرا اساس یہ ہے کہ یہ مطالبہ کسی بھی طرح غیر انسانی یا

غیر اخلاقی نہیں، بلکہ یہ میرا بنیادی حق ہے۔ ایرانی حکومت اور ایرانی عوام کو جذباتی ہونے کے بجائے اس مسئلے کو ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ حل کرنا چاہیے اور اپنے شہریوں کو بلاوجہ بڑھکا کر انہیں مشتعل نہیں کرنا چاہیے۔ غصے سے ویسے بھی معاملات بگڑ جاتے ہیں۔۔ کیا ہی اچھا ہو کہ امریکہ اور ایران دونوں ممالک میں امن ہو جائے۔۔۔۔" اس سے قبل کے میں مزید کچھ کہتا ایک پتھر اڑتا ہوا میرے پاس سے شاں کرتا ہوا گزر گیا۔

کسی ایرانی نے چیختے ہوئے فارسی میں ایک نعرہ لگایا اور مشتعل ہجوم بپھر تا ہوا احاطہ عدالت کا دروازہ توڑ کر اندر داخل ہو گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں ہڑبونگ مچ گئی اور پولیس نے ڈنڈے اور لاٹھیوں سے ان مشتعل مظاہرین پر ہلا بول دیا۔ ایرانی سیکرٹ سروس کے نقاب پوش اہلکاروں نے مجھے کور کیا اور مجھے چھپا کر دھکم پیل سے ہوتے ہوئے کمرہ عدالت میں داخل ہو گئے۔ انہوں نے مجھے اندر لے جا کر ایک بینچ پر بٹھایا اور اس کے ساتھ ہی دروازہ بند کر دیا۔ کوئی آدھے گھنٹے تک باہر خوب شور و غوغا ہوتا رہا اور پھر گہرا سکوت چھا گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے قانون نافذ کرنے والے اداروں نے حالات سنگین ہونے سے قبل ہی ان پر قابو پالیا ہو۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

کوئی پینتالیس منٹ کے بعد کمرے کا دروازہ کھلا اور جج صاحب اندر داخل ہوئے تو سب لوگ انکے احترام میں کھڑے ہو گئے۔ جب وہ اپنی کرسی پر بیٹھ گئے تو باقی سب نے بھی اپنی اپنی نشستیں سنبھال لیں البتہ میں مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا تھا۔ جج صاحب نے اپنے سامنے رکھی ہوئی فائلوں کا پلندہ کھولا اور پھر اپنی عینک کھول کر اسے اپنے کانوں لگالیا۔ آج حیرت انگیز طور پر میڈیا کو کمرہ عدالت سے باہر رکھا گیا تھا، جس سے یہ لگ رہا تھا کہ آج کچھ خاص ہونے جا رہا ہے۔ کچھ دیر جج صاحب یوں ہی فائل کو پڑھتے رہے پھر انہوں نے نظریں اٹھا کر میری جانب دیکھا اور پھر عدالتی سٹاف کی جانب دیکھتے ہوئے گویا ہوئے:

"رجسٹرار صاحب عدالت کو یہ بتایا جائے کہ عدالتی کاروائی اتنی تاخیر سے کیوں شروع کی گئی جبکہ آج اس عدالت کا وقت نو بجے تھا۔؟" یہ کہتے ہی وہ سوالیہ نظروں سے رجسٹرار صاحب کی جانب دیکھنے لگے۔

"جناب پہلے تو ہم عدالتی کاروائی لیٹ شروع کرنے کی معذرت چاہتے ہیں دوسرا ایسا کیوں ہوا، اس سوال کا جواب دینے کے لئے ایرانی حکومت کے اٹارنی جنرل نور رضا تہرانی صاحب تشریف لائے ہیں۔ وہی آپ کو اس تاخیر کی وجہ بتاسکتے ہیں۔۔۔" رجسٹرار صاحب نے اپنے ٹائپ رائٹر کے سامنے سے کھڑے ہو کر گفتگو کا آغاز کیا اور پھر دورانِ گفتگو انہوں نے ایک تھری پیس سوٹ میں ملبوس ادھیڑ عمر شخص کی طرف اشارہ کر کے ان کا تعارف کروایا تو وہ ہلکی سی

مسکراہٹ کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔

"جج صاحب میں بھی عدالتی کاروائی دیر سے شروع ہونے کی معذرت چاہتا ہوں۔ دراصل حکومتِ ایران برائن مور صاحب کے کوائف اکھٹے کر رہی تھی جس کی وجہ سے تاخیر ہوئی۔ یہ جو معزز شخص آپکی عدالت میں کھڑے ہیں یہ کوئی جاسوس نہیں بلکہ امریکا کے جانے مانے اور عالمی شہرت یافتہ سیاح جیریکو مور کے بیٹے ہیں اور پیشے کے اعتبار سے یہ بھی سیاح ہی ہیں۔اس بات کی تصدیق۔۔۔" نوررضا تہرانی نے کہتے کہتے تھوڑا سا توقف کیا اور اپنے سامنے پڑے ہوئے دوسرکاری کتابچے نکال کر اپنے ہاتھ میں لہراتے ہو کہنے لگے۔" اس پاسپورٹ سے اور انکے ٹریولنگ لاگ سے باخوبی ہو جاتی ہے۔۔۔" اس کے بعد وہ اپنی میز کے پیچھے سے نکلے اور چلتے ہوئے رجسٹرار صاحب کے پاس پہنچے اور انہیں یہ دونوں کتابچے پکڑا دیا۔

"وہ دراصل انکی شکل ڈیوڈ سے ملتی جلتی ہے مگر یہ ڈیوڈ نہیں ہیں۔ ہماری تحقیقات کے مطاق ڈیوڈ کا انتقال گزشتہ سال ایک ٹرین حادثے میں ہو چکا ہے اور اس کی آخری رسومات بھی ادا کر دی گئی ہیں۔۔۔اور یہ رہی ان کی موت کی سرکاری سند۔۔۔" یہ کہتے ہی انہوں نے اپنی ٹیبل پر ہاتھ بڑھا کر ایک کاغذ کا پرزہ اٹھایا اور اسے بھی رجسٹرار صاحب کو پکڑا دیا۔ انہوں نے چند لمحے اس پر سرسری سی نظر ڈالی اور پھر اس کے بعد یہ تمام چیزیں کھڑے ہو کر جج صاحب کے سامنے انکی ٹیبل پر رکھ دیں۔جج صاحب نے ایک ایک کر کے تمام کاغذات کو دیکھنا شروع کر دیا اور پھر کہنے لگے۔

"ان تمام کاغذات سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص جو کٹہرے میں کھڑا ہیں وہ ڈیوڈ نہیں بلکہ برائن مور ہی ہے اور اس کے ساتھ جو ٹریول لاگ دیا ہوا ہے اس کے مطابق یہ پہلے بھی تین بار ایران آچکا ہے اور اب یہ اس کا چوتھا چکر ہے۔ تو اٹانی جنرل صاحب اب انکی رہائش کن کے پاس ہے اور یہ یہاں کیا کرنے آتے ہیں ؟"

"جی یہ سیاح ہیں اور ان کا یہاں آنے کا مقصد بھی سیر وسیاحت ہی ہے۔جہاں تک ان کی رہائش کا تعلق ہے تو یہ فردوسی اسٹریٹ میں توقیر رضوی صاحب کے یہاں ہر بار مہمان کی حیثیت سے ٹھہرتے ہیں۔۔۔گزشتہ روز عدالت کے حکم پر انہیں یہاں بلایا گیا ہے اور یہ اپنے وکیل ہاشم عباس شیرازی صاحب کے ساتھ حاضر ہوئے ہیں۔۔۔۔" یہ کہتے ہی انہوں نے اپنے پاس بیٹھے ہوئے دو اشخاص کی جانب اشارہ کیا تو ان دونوں نے اپنے سروں کی ہلکی سی جنبش سے جج صاحب کو اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔وہ دونوں بڑی عمر کے تھے اور تھری پیس سوٹ میں ملبوس تھے۔یقیناً میری ان سے یہ پہلی ملاقات تھی،اب تک میرے کھیلے ہوئے پتے خوب کمال دیکھا رہے تھے اور میں دل ہی دل میں اس خوشگوار صورت حال سے جھوم رہا تھا۔

"میری عدالت سے گزارش ہے کہ اب توقیر رضوی صاحب کا موقف بیان کرنے کے لئے ان کے وکیل کو اجازت دی جائے تاکہ عدالت کے سامنے تمام حقائق واضح ہو سکیں۔۔۔"

"I object جج صاحب! اس سے قبل کے توقیر رضوی صاحب کے وکیل کھڑے ہو کر اپنا موقف پیش کریں، میں عدالت کی توجہ اس جانب مبذول کروانا چاہتا ہوں کہ عدالت کو یہ حکومت کے اٹارنی جنرل گمراہ کر رہے ہیں۔۔۔" اس سے قبل کہ جج صاحب توقیر رضوی کے وکیل کو اجازت دیتے استغاثہ کے وکیل ایک دم سے کھڑے ہوئے اور انہوں نے عدالتی کاروائی کا رخ دوسری طرف موڑنے کی کوشش کی۔ اس سے لگ رہا تھا کیس واقعی یکطرفہ نہیں ہو گا۔

"جی عباس شاہ صاحب آپکو اجازت ہے۔ یہ عدالت جاننا چاہتی ہے کہ اس عدالت کو یہ حکومتی اٹارنی جنرل کس طرح گمراہ کر رہے ہیں۔" جج صاحب نے نہایت تحمل سے ان کو اجازت دی تاکہ وہ بھی عدالت کو کچھ حقائق دکھا سکیں۔ وکیلِ استغاثہ کو اجازت ملتے ہی اٹارنی جنرل صاحب واپس اپنی کرسی پر جا کر بیٹھ گئے۔

"شکریہ جج صاحب عدالت کی اب تک کی کاروائی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اٹارنی جنرل صاحب اپنے ہی ملک کے سب سے قابل احترام ادارے کی کارکردگی کو مشکوک بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔۔۔ میرا اشارہ ایرانی سیکرٹ سروس کی طرف ہے جس کی کارکردگی کی تعریف کئی بار اس ملک کی اعلیٰ عدالت خود کر چکی ہے۔ نہ صرف عدالت بلکہ اس ملک کا میڈیا اور خود حکومت انکی جاری کردہ رپورٹس کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔۔۔ آخر یہ یکایک کیا ہوا ہے کہ کل تک امریکی جاسوس قرار پانے والا یہ شخص آج ایکدم سے معزز ہو گیا ہے؟۔۔۔" عباس شاہ صاحب نے اجازت ملتے ہی دھواں دھار تقریر شروع کر دی اور اس تقریر میں عدالت کی اب تک کی کاروائی پر سوالیہ نشان کھڑا کر دیا۔

"عباس شاہ صاحب آپ آخر کہنا کیا چاہتے ہیں، اس عدالت کو کھل کر بتائیں کہ آخر یہ سارا ماجرہ ہے کیا؟ اور آپ کو کیسے لگتا ہے کہ ہماری سب سے بڑی سیکرٹ سروس کی کارکردگی کو متنازیہ بنایا جا رہا ہے؟ ہم خود انکی کارکردگی کے سب سے بڑے معترف ہیں، ہم جانتے ہیں کہ ایرانی سیکرٹ سروس کی ایران کے لئے کیا خدمات ہیں۔"

"جج صاحب میں آپکا بے حد ممنون و مشکور ہوں کہ آپ نے میرے سیکرٹ سروس سے متعلق پیش کردہ حقائق کی تائید کی۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ ہمارا یہ قابل احترام ادارہ کتنی زبردست کارکردگی کا حامل ہے۔ مگر اٹارنی جنرل صاحب نے آج جو کچھ ایک امریکی جاسوس کو بچانے کے لئے آؤٹ آف داوے جا کر اس کا دفاع کیا ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔۔۔ انہوں نے آپ کو ٹریول لاگ اور پاسپورٹ دکھا کر ایرانی سیکرٹ سروس کی کارکردگی کو رد کرنے کی کوشش کی ہے یا دوسرے لفظوں میں کہیں کہ غلط ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔۔۔ ہمارے ادارے نے اس جاسوس مجرم کو

رنگے ہاتھوں ایران کی حساس تنصیبات کی فوٹوز لیتے ہوئے گرفتار کیا ہے۔نہ صرف یہ بلکہ انہوں نے آمنہ جہاں نامی ایرانی خاتون جن کا اپنا تعلق سیکرٹ سروس سے ہے کے بھائی حسام جہاں کو جس طرح بے ہیمانہ تشدد کر کے موت کے گھاٹ اتارا اس کے تمام ثبوت آج میں عدالت کے سامنے رکھنے جارہا ہوں۔انہیں یہ اٹارنی جنرل صاحب بچانا چاہتے ہیں۔یعنی حد ہوگئی۔۔" یہ کہتے ہی انہوں نے اپنے سامنے پڑا ہوا کاغذات کا ایک پلندہ اٹھا کر رجسٹرار صاحب کے حوالے کر دیا۔انہوں نے وہ کاغذات کھول کر چیک کئے اور پھر انہیں جج صاحب کی ٹیبل پر رکھ دیا۔عباس شاہ کے خوف ناک دلائل نے سب کو سانپ سنگھا دیا تھا۔کمرہ عدالت میں ایک گہرا سکوت طاری ہو گیا۔کچھ دیر تک جج صاحب کاغذات کو کھنگالتے رہے پھر کہنے لگے۔

"ان کاغذات سے بظاہر یہی لگتا ہے کہ یہ جو شخص اس وقت عدالت میں ملزم کی حیثیت سے کھڑا ہے اس کا تعلق امریکہ کی سب سے بڑی ایجنسی بلیک ڈائمنڈ سے ہے اور اس کا نام ڈیوڈ ہے۔اس نے چند سال قبل آمنہ جہاں کے بھائی حسام جہاں کو جو امریکہ میں تعلیم کی غرض سے گیا تھا اسے اغوا کر کے اپنے ہیڈ کوارٹر لے گیا اس کے بعد اسے خوب تشدد کا نشانہ بنا کر اسے دہشت گرد کا لیبل دیا اور پھر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔نہ صرف یہ بلکہ اس کے بعد اس کی لاش بھی غائب کر دی۔ آمنہ جہاں بے چاری عالمی عدالت کے چکر کاٹتی رہی پر اسے انصاف نہیں ملا۔اٹانی جنرل صاحب،عباس شاہ صاحب نے آپ کے اس سارے بیانئے میں دراڑ ڈال دی ہے اب آپ اپنی ہی سیکرٹ سروس کا کیسے دفاع کریں گے؟"جج صاحب نے اٹارنی جنرل صاحب کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا تو وہ ایک بار پھر مسکراتے ہوئے کھڑے ہوئے اور اپنی ٹیبل سے باہر نکل کر عباس شاہ صاحب کے سامنے آ گئے۔

"سب سے پہلے تو میں اپنے فاضل وکیل صاحب کی تعریف کرونگا کہ انہوں نے بھرپور دلائل دیئے ہیں۔بلاشبہ جن جذبات کا اظہار انہوں نے کیا ہے شاید اس سے بہتر الفاظ میں ایرانی سیکرٹ سروس کی کارکردگی کی عکاسی نہیں کی جاسکتی۔میں خود اپنی سیکرٹ سروس کا معترف ہوں اور انکے کارناموں پر فخر کرتا ہوں۔میں اس معزز عدالت کو یقین دلاتا ہوں کہ ایرانی حکومت کا مقصد قطعاً اپنے ادارے کی تضحیک نہیں ہے بلکہ اگر یہ سب کاروائی نہ ہوتی تو عدالت کے سامنے حقائق کیسے واضح ہوتے۔۔۔۔وہ دراصل قصہ کچھ یوں ہے کہ یہ سب غلط فہمی آمنہ جہاں کی وجہ سے ہوئی ہے۔وہ کچھ عرصہ قبل ہی ہماری سیکرٹ سروس سے منسلک ہوئی ہیں اور انکی کارکردگی شروع میں ہرگز متنازیہ نہیں تھی۔لیکن جیسے دنیا کی ہر سیکرٹ سروس سے بھول ہوتی ہے ویسے ہی ہماری سیکرٹ سروس سے بھی ہوئی۔کیونکہ وہاں بھی انسان کام کرتے ہیں اور بھول چوک انسانوں سے ہی ہوتی ہے۔انہوں نے ضرورت سے زیادہ ان پر اعتماد کیا جس کی وجہ سے برائن مور

جیسے معزز شخص کو اس قدر تکلیف ہوئی۔۔۔ڈیوڈ کی موت کا علم ہمارے ادارے کو پہلے سے ہی تھا مگر یہ بات انہوں نے آمنہ جہاں سے شیئر نہیں کی۔ جس کی وجہ سے وہ اس بات سے لاعلم رہیں اور ایک معزز شخص کو محض ہم شکل ہونے کی وجہ سے اپنے بدلا لینے کی آگ میں جھلسا دیا۔" اٹارنی جنرل نے ابھی اپنی بات مکمل کی ہی تھی کہ اسکے ساتھ ہی عباس شاہ نے تالیاں بجانی شروع کر دیں۔

"جج صاحب میں معذرت چاہتا ہوں مگر ان کی یہ باتیں کافی مضحکہ خیز ہیں کہ ایک پوری سیکرٹ سروس کو محض آمنہ جہاں جیسی کمزور سی خاتون نے اپنی انگلیوں پر نچوا رکھا تھا اور اپنے بدلے کی آگ میں ایک معصوم سے شخص سے وہ بدلا لینے چلی گئیں۔ کیا اس کی خبر ہماری سیکرٹ سروس کو نہیں تھی ؟ انہیں ڈیوڈ کی موت کا تو علم تھا مگر وہ اس بات سے لاعلم تھے کہ آمنہ جہاں ایک خفیہ مشن پر گامزن ہیں اور وہ خفیہ مشن اور کوئی نہیں بلکہ انکے اپنے ہی بھائی کا بدلا لینا ہے۔ مگر وہ یہ بدلہ برائن مورسے ہی کیوں لینا چاہیں گی؟ جس شخص کو بدلہ لنے کی آگ ہو وہ یہ کیسے بلا تصدیق کے ایک عالمی شہرت یافتہ سیاح کو توقیر رضوی صاحب کے گھر سے اٹھائے اور پھر اس پر جاسوسی کا الزام لگا کر عدالت میں پیش کر دے گا۔ان تمام باتوں کا آپس میں بظاہر کوئی سر پیر معلوم نہیں ہو رہا بلکہ میری ناقص عقل میں یہ سب باتیں نہیں بیٹھ رہیں۔ وہی سیکرٹ سروس جس کی ہم اس قدر تعریف کرتے ہیں ؟ کیا وہ محض ایک خاتون سے دھوکا کھا گئے ؟ وہ ایک پروفیشنل ادارہ ہے، مگر آپکی باتوں سے لگ رہا ہے کہ وہاں پر فیشنلزم نام کی کوئی چیز نہیں۔ کیا ایک خاتون جسے سیکرٹ سروس جوائن کیے ابھی اتنا عرصہ بھی نہیں ہوا، از خود یہ فیصلہ کر سکتی ہے کہ انہیں کس مشن کو سرانجام دینا ہے اور کسے نہیں ؟ آپکی باتوں سے تو یہ لگ رہا ہے کہ ہماری سیکرٹ سروس میں اتحاد نام کی کوئی چیز نہیں جسکا جب دل چاہتا ہے وہ اٹھ کر کسی سے بھی بدلا لینے چلا جاتا ہے۔ آپ کے پاس اس حوالے سے کیا ثبوت ہے کہ وہ بدلا لے رہی تھیں یا آپ نے محض یہ بات ہوا میں تیر کے طور پر چلائی کہ شاید وہ تیر نشانے پر لگ جائے۔اور دوسری بات، آمنہ جہاں سے اس کے اپنے ادارے نے ڈیوڈ کی موت آخر کیوں چھپائی ؟" عباس شاہ نے طنزیہ انداز میں کہا تو اس کے جواب میں اٹارنی جنرل صاحب نے اپنی ٹیبل پر رکھی ہوئی فائل سے ایک سفید کاغذ نکال کر اپنے سامنے کر لیا اور پھر اس سرسری نگاہ ڈالنے کے بعد گویا ہوئے۔

"میرے علم میں نہیں تھا کہ میرے فاضل دوست میری اس بات کو محض ٹھٹھے میں اڑا دیں گے۔ حالانکہ وہ یہ بات جانتے ہیں کہ میں ایرانی حکومت کا وکیل ہوں۔ایران کا سب سے بہترین وکیل جو کوئی بھی کونہ خالی نہیں رہنے دیتا۔۔۔جہاں تک تعلق ہے سیکرٹ سروس کی بلا تصدیق کے بعد بات کرنی تو میں اس کی سختی سے تردید کرتا ہوں۔ ہمارا

ادارہ نہایت منظم ہے اور اس میں کسی قسم کی کوئی ایسی چیز نہیں جس سے ادارے کی بدنامی ہو۔ کچھ باتیں صغیہ راز میں رکھی جاتی ہیں۔ یہ ہمارے ادارے کی ساخ کا مسئلہ ہے۔ سیکرٹ سروس سیکرٹ ہوتی ہی اس لئے ہے کہ اس کے معاملات پوشیدہ رکھے جائیں۔ جہاں تک بعد آمنہ جہاں کی تو کل انہیں خود عدالت میں پیش کر کے تمام واقعات خود انہی کے منہ سے سن لئے جائیں تو زیادہ بہتر ہے۔ سیکرٹ سروس پر یوں کھلے عام بات کرنا غداری کے مترادف ہے۔ میں اپنے فاضل دوست سے یہ التجا کرتا ہوں کہ وہ اپنے الفاظ کا چناؤ خوب سوچ سمجھ کر کریں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ انکی وجہ سے پوری دنیا میں ہماری جگ ہنسائی ہو۔۔۔۔۔۔۔۔یہ رہی آمنہ جہاں کی میڈیکل رپورٹ جسے اس ملک کے سب سے قابل سائیکاٹرسٹ نے مرتب کیا ہے اور انکے بقول آمنہ جہاں نے خود یہ بات انکے سامنے ایڈمٹ کی ہے کہ جب سے ان کے بھائی کی موت ہوئی ہے ان کے سینے میں آگ لگی ہوئی ہے کہ کسی طرح سے ڈیوڈ کو اغوا کریں اور اسے اسی طرح تشدد کر کے ماردیں۔۔۔ڈاکٹر صاحب کے بقول ایرانی سیکرٹ سروس کے کہنے پر انکا چیک اپ کرایا گیا۔ جس کے بقول گزشتہ کچھ ایام سے وہ نفسیاتی طور پر فٹ نہیں لگ رہی تھیں۔ اب تک عدالت میں جو باتیں کی گئیں وہ آمنہ جہاں کی ہی مرتب کی گئی انٹرنل رپورٹ کی بنیاد پر ہیں۔۔۔۔۔ـــــــ" اٹارنی جنرل صاحب واقعی اپنے کام کے پکے تھے انہوں نے جیسے ہی یہ میڈیکل رپورٹ جمع کروائی تو اب لگ رہا تھا کہ یہ کیس میرے حق میں ہو گیا ہے۔ مگر اس سے قبل کہ جج صاحب اس رپورٹ کو دیکھتے عباس شاہ صاحب نے اپنا آخری تیر چلایا۔

" اس رپورٹ کا مطلب یہ ہے کہ ہماری ٹاپ کی سیکرٹ سروس نے جو اِن سے خدمات لی تھیں وہ انکے مس فٹ ہوتے ہوئے لی تھیں تو اگر وہ کارکردگی قبول کی گئی تو یہ کیوں نہیں؟ کیا ایک مس فٹ خاتون سیکرٹ سروس میں رہ سکتی ہیں؟ دوسرا آج اتنی اہم عدالتی کاروائی میں میڈیا کو کیوں باہر رکھا گیا اس کی وضاحت بھی درکار ہے۔ آخر ہماری قوم کو پتہ ہونا چاہیے کہ یہاں کمرہ عدالت میں کیا ہو رہا ہے؟"

" دیکھیں آپکے پہلے سوال کا جواب تو یہ میڈیکل رپورٹ ہے جو ان کی ہماری سیکرٹ سروس میں جوائن ہونے سے پہلے لی گئی تھی۔ اس وقت یہ مکمل فٹ تھیں مگر جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ گزشتہ کچھ دنوں سے انکی حالت ٹھیک نہیں تھی اسی لئے ان کا چیک اَپ کروایا گیا۔۔۔یہ رہی انکی سابقہ میڈیکل رپورٹ۔۔۔" اٹارنی جنرل صاحب جو اس وقت فل ہوم ورک کے ساتھ آئے تھے ہر تیر کا جواب وہ خندہ پیشانی سے دے رہے تھے۔ انہوں نے اپنی فائل میں سے ایک اور کاغذ نکال کر رجسٹرار صاحب کے حوالے کر دیا۔

" عباس شاہ صاحب جہاں تک آپ کا یہ اعتراض کہ میڈیا کے نمائندوں کو کیوں آج عدالتی کاروائی سے دور

رکھا جارہا ہے تو اس کا بڑا سیدھا سا جواب ہے کہ آج آپ نے خود ہی دیکھ لیا کے مشتعل افراد نے کس طرح احاطہ عدالت میں دھاوا بولا ہے۔ میڈیا کی لائیو کوریج نے سارا ماحول خراب کر دیا ہے۔ لوگ آپے سے باہر ہو گئے ہیں اور ہم بطور حکومت لوگوں کی جان مال عزت و آبرو کی حفاظت کا ذمہ لئے ہوئے ہیں۔ آخر ہم یہ کیسے اجازت دے دیں کہ ہماری آنکھوں کے سامنے لوگوں کی جانوں کا یا سرکاری املاک کا نقصان ہو۔ ہم نے قابل احترام جج صاحبان کی حفاظت کرنی ہے اس ملک کے حالات کو کنٹرول میں رکھنا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ایران، انقلاب کے بعد جن حالات سے گزر رہا ہے وہ بہت نازک ہیں۔ ہمارے دشمن ہماری گھات میں ہیں اور ہم انہیں کیسے یہ موقعہ دے دیں کہ وہ ملکی حالات کو اپنے کنٹرول میں کر کے انارکی پھیلائیں۔ لہذا ملک و قوم کے وسیع تر مفاد میں میڈیا کو باہر رکھا گیا ہے اور چونکے بطور حکومت جب برائن مور صاحب کے حوالے سے حقائق ہمارے سامنے آئے تو یہ ہمارا فرض بنتا ہے کہ ہم انکی بھی حفاظت کریں اور انکے ساتھ کسی بھی قسم کی ناانصافی نہ ہونے دیں۔ جس طرح ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم ایک خدار قوم ہیں تو ہمیں اس بات کا ثبوت اپنے ہر عمل سے دینا چاہیے۔ ہمیں اپنی ہر بات سے یہ ظاہر کرنا چاہیے کہ ہم امن پسند ہیں اور دوسرے ممالک کے شہریوں کی حفاظت بھی کر سکتے ہیں۔ اسی چیز کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم نے رجسٹرار صاحب سے گزارش کی کہ حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے میڈیا کو کمرہ عدالت سے باہر رکھا جائے۔ تاکہ عام شہریوں میں ہیجان اور سنسنی نہ پھیلے۔ مجھے امید ہے کہ میں عدالت کو اپنے دلائل سے مطمئن کر پایا ہوں۔۔۔۔" اٹارنی جنرل کے تفصیلی جواب کے بعد عباس شاہ صاحب گویا چاروں شانے چت ہو چکے تھے۔ انہوں نے ہاتھ کھڑے کر دیئے اور واپس آ کر اپنی کرسی پر بیٹھ گئے۔

" اٹارنی جنرل صاحب آپکے دلائل اور ہوم ورک قابل تحسین ہے۔ آپ کی اہم باتیں ہم نے نوٹ کر لی ہیں۔ اب ہم چاہیں گے کہ عدالتی ریکارڈ کے لئے توقیر رضوی صاحب کے وکیل آئیں اور اپنا موقف پیش کریں۔" جج صاحب کی تعریف پر ہلکا سا تبسم اٹارنی جنرل صاحب کے چہرے پر آیا اور پر وہ دوبارہ سنجیدہ ہو گئے۔ ان کے بعد توقیر رضوی صاحب کے وکیل کھڑے ہوئے اپنے کاغذات کے ہمراہ سیدھا رجسٹرار صاحب کے پاس پہنچے۔

"جج صاحب میرا نام اسحق جہانگیری ہے اور میں توقیر رضوی صاحب کا وکیل ہوں۔ توقیر رضوی صاحب اس ملک میں سب سے بڑے رئیل اسٹیٹ کے ٹائیکون ہیں۔ آپ کی خدمات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہیں، آپ اس ملک کے فلاحی کاموں میں بڑھ چڑھ کے حصہ لیتے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ انکی حکومتی سطح تک گڈوِل (Good Will) ہے۔ آپ حکومت کے کئی بار اہم سرکاری کاموں میں مدد بھی کر چکے ہیں۔ اسلامی جمہوریا ایران میں خدا نے شاید انہیں لوگوں کی خدمت کے لئے منتخب کر لیا ہے۔ یہ نہ صرف غریبوں کے لئے لنگر چلاتے ہیں بلکہ رمضان میں سحری و افطاری کا بھی خصوصی انتظام

کرتے ہیں۔اسی اچھی ساکھ کی بنا پر دنیا جہاں کے امراء،وزیر اور ڈپلومیٹ وغیرہ اکثر انکے یہاں خاص مہمان ہوتے ہیں ۔رب نے انہیں جس دولت سے نوازہ ہے یہ اس سے سبھی کا خیال رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔مگر نیکی کر دریا میں ڈال کے مصداق یہ کبھی سامنے نہیں آتے۔آپ نے کبھی انکا اخبار یا ٹی وی انٹرویو نہیں دیکھا ہوگا۔بہت خدا ترس انسان ہیں، انسانیت سے محبت کرنا ان کے خون میں شامل ہے۔یہ لوگوں سے جتنی محبت کرتے ہیں بدلے میں انہیں بہت سی محبت ملتی ہے۔یہ سب اللہ کا ان پر کرم ہے۔۔۔یہ جو شخص آپکی عدالت میں کھڑے ہیں، یہ کوئی غیر ملکی جاسوس نہیں بلکہ عالمی شہرت یافتہ سیاح جیریکو مور کے بیٹے برائن مور ہیں۔ان کے والد کئی بار عالمی سیاست کے برعکس سیاحت کی غرض سے ایران آچکے ہیں۔اب یہی کام ان کے بیٹے برائن مور سرانجام دے رہے ہیں۔یہ بھی توقیر رضوی صاحب کے خاص مہمان ہیں اور انہیں خفیہ ادارے والوں نے ایک غلط فہمی کی بنیاد پر انکے فارم ہاؤس سے گرفتار کیا ہے۔انکے ساتھ واقعی ناانصافی ہو رہی تھی مگر آج جس طرح اٹارنی جنرل صاحب نے ایک ظلم و ناانصافی کو روکا ہے وہ اس کے لئے تعریف کے مستحق ہیں۔میری عدالتِ عظمیٰ سے یہ اپیل ہے کہ وہ برائن مور کو جلد از جلد رہا کریں کیونکہ وہ امریکہ سمیت اس پوری دنیا کا اثاثہ ہیں۔تاکہ عالمی سطح پر جس طرح ایران کے خلاف propaganda ہو رہا ہے اس کو فل فور ریورس کیا جاسکے ۔شکریہ" یہ کہتے ہی وہ جاکر واپس اپنی کرسی پر بیٹھ گئے توجج صاحب کچھ دیر تک قلم اٹھا کر کچھ لکھتے رہے پھر انہوں نے سر اٹھا کر عباس شاہ کو دیکھا اور پھر گویا ہوئے:

"عباس شاہ صاحب کیا آپ اب تک کی کاروائی پر کوئی تبصرہ کرنا پسند کریں گے یا جو کچھ ہو رہا ہے اسے چلنے دیا جائے۔" انکی بات سن کر عباس شاہ صاحب کھسیانی سی ہنسی ہنستے ہوئے کھڑے ہوئے اور کہنے لگے۔

"جی میرا خیال ہے کہ جس طرح اٹارنی جنرل صاحب نے آج کیس لڑا وہ واقعی قابل رشک ہے۔یقیناً میرے پاس فی الحال تو کوئی دلائل نہیں ہیں کہ جس سے میں ملزم کے کٹہرے میں کھڑے ہوئے شخص کی شخصیت پر کوئی سوالیہ نشان کھڑا کر سکوں۔" ان بات سن کر جج صاحب تحسین آمیز انداز میں اٹارنی جنرل کی طرف دیکھنے لگے۔اس کے بعد وہ کہنے لگے۔

"آج کی کاروائی میں واقعی اٹارنی جنرل صاحب نے جو کیا ہے وہ واقعی بہت خوب ہے اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے وہ کم ہے مگر میں اب بھی انہیں رہائی کا حکم نہیں دے سکتا۔یہ ہمارے مہمان ضرور ہیں مگر یہ عدالت ہر لحاظ سے تسلی کر لینا چاہتی ہے۔لہذا یہ عدالت حکم دیتی ہے کہ برائن مور کو سیکرٹ سروس کی کسٹڈی سے لیکر ایرانی سول گارڈز کی کسٹڈی میں دیا جائے اور انکے ساتھ اچھا برتاؤ کیا جائے۔انکے کھانا پانی اور دیگر ضروریات کو فوری طور پر پورا کیا جائے۔

اس کے علاوہ یہ عدالت حکم دیتی ہے کہ آمنہ جہاں کو بھی ایرانی سول گارڈز فوراً گرفتار کریں اور انہیں کل عدالت میں دس بجے پیش کیا جائے۔ یہ عدالت کل آمنہ جہاں کے بیان کے بعد اپنا حتمی فیصلہ سنائے گی تب تک کے لئے یہ عدالت برخاست کی جاتی ہے" جج صاحب نے یہ اعلان کیا ہی تھا کہ میرے چہرے پر بہار آگئی، میرے ساتھ دیگر افراد جنہوں نے میری رہائی کی اس قدر کوششیں کی تھیں ان کی خوشی بھی دیدنی تھی۔ سب سے پہلے مجھے ہتھکڑیوں سے آزاد کرایا گیا، میری یہ وقتی رہائی کسی معجزے سے کم نہیں تھی۔واقعی ایک اعصاب شکن سفر اب ایک اچھے موڑ پر آن پہنچا تھا۔اٹارنی جنرل صاحب خود چل کر میرے پاس آئے اور بھرپور انداز میں مجھے گلے لگالیا۔

"مبارک ہو اب آپکی رہائی کل ہی ہو جائے گی۔۔۔۔"

"شکریہ جناب میں آپکا بے حد مشکور ہوں کہ آپ نے میری خاطر اتنی محنت کی اور بھرپور دلائل کے ساتھ میری رہائی تقریباً ممکن بنادیاہے۔آپ بلاشبہ کسی فرشتے سے کم نہیں ہیں، میں آپکا جتنا بھی شکریہ ادا کروں وہ کم ہے۔۔۔"

" ارے نہیں نہیں برخوردار۔۔۔پاکستانیوں کے لئے تو جان بھی حاضر ہے پھر یہ تو ایک معمولی سا کام تھا۔۔۔"

انہوں نے یہ بات دھیمے سے انداز میں آنکھ دبا کر کی تو میرے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ آگئی اور میں نے مثبت انداز میں سر ہلادیا۔اس کے بعد توقیر رضوی صاحب کے وکیل ملے انہوں نے بھی مبارک بعد دی اور سب سے آخر میں خود توقیر رضوی صاحب آئے اور مجھے زور سے جھپی ڈال دی۔ کچھ دیر وہ یوں ہی میرے سینے سے لگے رہے پھر میرے کان میں ہلکی سی سرگوشی کی:

" ویسے تمہیں توقیر رضوی کا پتہ کیسے چلا۔۔؟" ان کے اس مذاق پر میں قہقہہ لگا کر ہنس پڑا اور بے اختیار اپنے سر پر ہاتھ پھیر لیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

شام کے کوئی پانچ کا عمل تھا، میں اس وقت ایرانی سول گارڈز کے ہیڈ کوارٹر پر ٹھنڈے اے سی کے روم میں موجود تھا۔میرے پاس ہی صوفے پر توقیر رضوی صاحب انکے وکیل اور اٹارنی جنرل نوررضا تہرانی موجود تھے اور کمرہ ساؤنڈ پروف تھا میں یہاں مجرم کی حیثیت سے نہیں بلکہ مہمان کی حیثیت سے موجود تھا۔ہم سب سگار کے گہرے کش لے رہے تھے۔احاطہ عدالت سے مجھے ایرانی سول گارڈز ایک بکتر بند گاڑی میں لے گئے تھے۔اگرچہ مشتعل افراد اب وہاں موجود نہیں تھے مگر وہ کسی بھی قسم کا رسک نہیں لینا چاہتے تھے۔

ان کا ہیڈ کوارٹر عدالت سے کوئی پچیس تیس منٹ کی دوری پر تھا۔ یہاں پہنچ کر مجھے ایک الگ کمرہ دیا گیا جس کے

ساتھ ایک اٹیچ باتھ بھی تھااور اس کی الماری میں بہترین تراش کے سوٹ بھی لٹکے ہوئے تھے۔ ان سب کا رویہ بہت دوستانہ تھااور سب لوگ مجھے مہمانوں کی طرح ہی سے ٹریٹ کر رہے تھے۔ایران میں میراانتہائی تیز رفتار اور تھکادینے والاسفر اب ایک مہمان کی حیثیت سے یہاں تک پہنچا تھا۔عدالتی حکم کے باوجود میں اب بھی کافی محتاط تھا، میں یہاں پر اپنے سابقہ تجربے کی بنیاد پر کسی پر بھی زیادہ بھروسہ نہیں کر رہا تھا۔

سب سے پہلے میں نے اپنے لئے ایک بہترین گرے کلر کے تھری پیس سوٹ کا انتخاب کیا، کپڑے واقعی میرے ناپ کے تھے اور پھر میں اس کے بعد سیدھا واش روم میں چلا گیا۔اپنے بدن کو کپڑوں سے آزاد کر کے میں وہاں شاور کی ٹونٹی کھول کر اس کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ساتھ ہی باتھ ٹب بھی موجود تھا مگر میں نے شاور کا ہی انتخاب کیا۔شاور سے ٹھنڈا ٹھار پانی میرے پورے بدن پر گر رہا تھا۔وہ جوں جوں گر رہا تھا ویسے ویسے میری روح تک کو مہکاتا جارہا تھا۔کچھ دیر میں یوں ہی کھڑا ٹھنڈے پانی کا مزہ لیتارہا اس کے بعد میں نے ہاتھ بڑھا کر باڈی واش اٹھالیا اور پھر اسے ہاتھوں میں لیکر پورے بدن پر ملنے لگا۔یہ عمل واقع میری ہڈیوں میں اتر کر انہیں تازگی بخش رہا تھا۔اس کے بعد میں نے ہاتھ بڑھا کر شیمپو کی بوتل اٹھائی اور پھر اسے بھی تھوڑا سا اپنے ہاتھ میں لیکر بالوں میں لگانے لگا۔میرے سر اور بدن میں کئی دنوں میں میل چپکی ہوئی تھی۔ جس سے واقعی مجھے بہت کوفت ہو رہی تھی،سوچیں اگر مجھے اتنی کوفت ہو رہی تھی تو میرے ساتھ والے لوگوں کو کتنی نہ ہو رہی ہو گی۔ بلکہ انہیں صرف کوفت نہیں بدبو بھی آرہی ہو گی۔

میں کوئی آدھے گھنٹے پینتالیس منٹ تک خوب مزے لے لے کر نہاتا رہا۔اس دوران مجھے کسی نے بھی ڈسٹرب نہیں کیا۔اس کے بعد میں نے واش روم سے نکل کر تولیہ اپنے سامنے کارپٹ پر بچھادیا اور پھر خود اس کے اوپر کھڑا ہو گیا۔میرے بدن کا سارا ٹھنڈا ٹھار پانی اس کے اوپر تیزی سے گرنا شروع ہو گیا۔میں نے ہاتھ بڑھا کر ایک اور تولیے کو اپنے ہاتھ میں لیا اور پھر اس سے اپنے بدن کو خشک کرنے لگا۔اپنے جسم کو خوب اچھی طرح سے خشک کرنے کے بعد میں نے وہ بہترین تراش کا سوٹ پہننا شروع کیا اور پھر ٹیبل مرر کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی ٹائی ایڈجسٹ کرنے لگا۔

جب میں تیار ہو کر کمرے سے باہر نکلا تو اس وقت تین کا عمل تھا۔اٹارنی جنرل صاحب اور توقیر رضوی وہاں تا حال نہیں پہنچے تھے۔مجھے وہاں سے سیدھا ڈائننگ ہال میں لے جایا گیا۔مجھے شدید بھوک لگ رہی تھی اور کھانے کو دیکھ کر میرے پیٹ میں بڑے بڑے دیو انگڑائیاں لینے لگے۔وہاں ایک نوجوان نے نہایت خوبصورت انداز میں انگریزی میں خوشا آمدید کہا اور اس کے ساتھ ہی اپنا تعارف علی شیرازی کی حیثیت سے کروایا۔وہ وہاں کا گرینڈ شیف تھا اور اس نے باقاعدہ شیف کا یونیفارم پہنا ہوا تھا۔

" آیئے سر بیٹھیے میں یہاں کا گرینڈ شیف علی شیر ازی ہوں اور میں نے آپکے لئے ایران کا روائتی فوڈ بنایا ہے۔ امید ہے اس سے پہلے بھی آپ نے یہ کھایا ہو گا اگر نہیں تو اب جو آپکو مزہ آنے والا ہے اسے آپ کبھی نہیں بھولیں گے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ آپ ایک سیاح ہیں اور ایران سیر و سیاحت کے لئے آئے ہیں تو اب آپکو ہم اپنی مہمان نوازی دکھاتے ہیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اور اس کے ساتھ ہی اس نے ایک کرسی کھینچ کر باہر نکال لی۔ یہ ایک بڑا ڈائننگ ہال تھا اور اس میں ایک بہت ہی لمبی ٹیبل سجی ہوئی تھی۔ ٹیبل کو بہترین انداز میں پھولوں کے گلدانوں اور دیگر چیزوں سے خوبصورتی کے ساتھ سجایا ہوا تھا۔ وہ واقعی ایک ڈریم جگہ تھی، ایرانی بے شک مہمان نواز تھے اور اب وہ اپنی بہترین مہمان نوازی کا ثبوت دے رہے تھے۔

"شکریہ جی میں آپ کا بے حد شکر گزار اور ممنون ہوں۔۔۔ آپ نے تو اس قدر تکلف کر دیا۔۔۔ واقعی اس کی ضرورت نہیں تھی" میں نے مسکراتے ہوئے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا تو جواباً اس کی مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی۔

" ارے نہیں جناب آپ ہمارے خاص مہمان ہیں اور مہمانوں کی خدمت کرنا ہمارا ایمان ہے۔۔۔" اس کے بعد اس نے ایک ایک کرکے ایرانی ڈشوں میں سے پردے ہٹانے شروع کئے اور اس کے ساتھ ساتھ ان کے تعارف بھی کرانے لگا۔

"یہ ایرانی پلاؤ ہے۔۔۔ جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ ایک کیک کی شکل میں ہے۔ اوپر سے گولڈ کلر میں ہے اور نیچے سے سفید چاول ہیں۔۔۔۔ اسکے بعد یہ دیکھیں یہ بختیاری کباب ہیں، اسے خاص طور پر سیخ پر بنایا جاتا ہے اور یہ ہمیشہ ایرانی پلاؤ کے ساتھ ہی کھائے جاتے ہیں۔۔۔ اس کی خوشبو سونگیں تو آپکے پورے وجود میں قرار آجائے گا۔۔۔ آہا۔۔ ہا۔۔۔ہا۔۔۔ کیا بات ہے جی کیا کہنے۔۔۔۔ یہ اور دیکھیں جی ایسی لذیز فوڈ اسے کھانے سے پہلے ہی آپکے منہ میں پانی آجائے گا اور میں یہ دعویٰ سے کہتا ہوں کہ ایسا فوڈ آپ نے کبھی زندگی میں نہیں کھایا ہو گا۔۔۔۔ اسے گورمے سبزی کہتے ہیں۔۔۔۔" اس کے بعد وہ روانی سے ایک ایک فوڈ کی نقاب کشائی کرتا جا رہا تھا مگر میں اس سے بے نیاز کھانے میں مگن ہو گیا کیونکہ بھوک زوروں کی لگی ہوئی تھی اور میں کئی دنوں کا بھوکا تھا۔ کھانا واقعی بہترین بنا ہوا تھا زندگی میں واقعی پہلی بار ایسے کھانے کا اتفاق ہوا تھا اور رگوں میں پھوٹنے والے خون کی روانی بھی تیز ہو گئی تھی۔ علی شیر ازی واقعی اپنے کام کا ماہر تھا، میں نے زندگی میں کئی شیفس کا کھانا کھایا تھا مگر اس کی کچھ الگ ہی بات تھی۔ اسکی کھانے بنانے کے ساتھ زبان بھی خوب چلتی تھی اور وہ جس طرح اپنی زبان کا تڑکا لگا کر اپنے کھانے کی تعریف کرتا تھا وہ واقعی قابلِ

ذکر تھا۔

میں کوئی آدھے پونے گھنٹے تک خوب سیر ہو کر کھانا کھاتا رہا۔ معلوم ہوتا تھا کہ میں کئی سالوں کا بھوکا ہوں ایسی خوفناک بھوک مٹانے صرف اور صرف علی شیرازی جیسے کمال شیف کا ہی کام تھا۔ ابھی کھانے کا سیشن ختم ہوا ہی تھا کہ علی شیرازی کے باورچیوں کی ایک ٹیم اندر آگئی اور انہوں نے پلک جھپکتے ہی پوری ٹیبل صاف کر دی۔ میں نے کھڑے ہو کر پاس کے واش بیسن سے اپنے ہاتھ دھو کر خوب اچھی طرح سے قلی کی اور پھر دوبارہ اپنی کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔ اب ایرانی قہوے کا ٹائم تھا، وہ بھی کمال تھا اس کے ساتھ بادام اور تازہ ڈرائی فروٹ نے مزہ دوبالا کر دیا تھا۔

"اچھا علی شیرازی یہ بتاؤ تم یہاں کتنے عرصے سے کام کر رہے ہو۔۔۔"

—" جناب میں یہ کام گزشتہ پانچ سالوں سے یہاں کر رہا ہوں، اس سے قبل کوئی پندرہ بیس سال تک میرے والد نے اس ادارے کی خدمت کی ہے۔ بلاشبہ یہ ادارہ حکومت کے بہترین اداروں میں سے ایک ہے۔ یہ صاحب افسر لوگ بہت عزت کرتے ہیں تبھی تو ہم یہاں پر اتنے عرصے سے کام کر رہے ہیں اور کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ یہ سول گارڈز کا ادارہ انقلابِ ایران کے بعد وجود میں آیا تھا۔ یہ ملک میں دوسرے درجے کا دفاعی ادارہ ہے۔ یہاں پر نا صرف جرائم کی روک تھام کے لئے ونگز موجود ہیں بلکہ اندرونی دفاع سے متعلق بھی بہت سے ونگز انتہائی جاں فشانی سے کام کر رہے ہیں ۔۔۔ باقی صاحب ہم چھوٹے لوگ ہیں ، ہمیں اس ادارے کے بارے میں جتنا پتہ تھا وہ میں نے آپکو بتا دیا۔ اس سے زیادہ تو میرے فرشتے بھی نہیں جان سکتے۔" اس کی اب تک کی گفتگو سے ایک بات تو واضح ہو گئی تھی کہ وہ کافی باتونی ہے اور ہر بات بہت تفصیل سے بتانے کا عادی ہے۔

"تمہاری اس وقت کیا عمر ہے اور تمہارے گھر میں کون کون ہوتا ہے؟"

" صاحب بہادر میرے گھر میں ایک چھوٹی بہن ہوتی تھی اس کی ہم نے شادی کر دی۔ والد صاحب رہے نہیں انکا پچھلے سال کار ایکسیڈنٹ ہوا تو ان کی موت واقع ہو گئی۔ گھر میں اب صرف ماں ہے تو اسی کو پال رہا ہوں۔ اس نے میری بہت خدمت کی ہے اور اب یہ میری باری ہے کہ میں انکو اپنی طرف سے کچھ لوٹاؤں۔ سو میں اب وہی کچھ کر رہا ہوں۔۔۔ گھر جا کر ماں کے پیر دباتا ہوں، انکے بالوں کی مالش کرتا ہوں۔ انکے روٹی پانی سب کا خیال رکھتا ہوں۔ انہیں دھوپ پڑنے نہیں دیتا، جیسے اس نے اپنی ممتا کی چھاؤں میں مجھے پالا ہے اب میں اسے گھر کی ٹھنڈی اور پر سکون چھت سے سایہ دینے کی کوشش کرتا ہوں۔ بس میری ایک ہی خواہش ہے کہ میں اسے حج کروادوں تاکہ میرے سر پر جو ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے اسے ادا کر دوں۔۔۔۔" یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ تو میں نے آگے بڑھ کر اسے اپنے سینے سے

لگالیا۔

" ارے ارے پگلے یہ کیا کر رہے ہو۔ اتنے بڑے ہو کر رو رہے ہو۔ کوئی بات نہیں حوصلہ رکھو، جب میرے رب نے چاہا تو وہ تمہیں اپنی چوکھٹ پر بلالے گا۔ اس کے در سے کبھی مایوس نہ ہو۔۔ ہم سب کا پالنے والا ہے، وہی ہے جو بے زبان جانوروں کو انکی خوراک دیتا ہے۔ وہی ہے جو ہر چیز پر قادر متعلق ہے۔ وہ جب چاہے گا سب دروازے کھول دے گا اور سب مشکلیں آسان کر دے گا تم مایوس مت ہو۔۔۔" میں نے اس کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے اس کی تسلی دی تو وہ بے چارہ غریب میری اسی ادا پر فدا ہو گیا۔

" صاحب جی آپ بہت عظیم ہو، آپ نے جس طرح مجھے حوصلہ دیا ہے اور جس طرح میری ہمت بندھائی ہے میری رب سے دعا ہے کہ میری زندگی بھی آپکو لگ جائے۔ آپ جیو ہزاروں سال اور صدا خوش رہو۔" وہ دعائیں دیتا ہوا وہاں سے چلا تو میں اپنا قہوہ اور دیگر مشروبات کو ختم کرتا ہوا وہاں سے اٹھا اور پھر سیدھا اپنے کمرے میں آگیا۔ اب کوئی چار کا عمل ہو گا جب میں نے یہاں آکر کمرے کا دروازہ بند کیا تو مجھے کرنل اشر کی یاد ستانے لگی۔

مگر یہاں سے کرنل اشر کو رابطہ کرنا کسی مصیبت سے خالی نہیں تھا اور مجھے ابھی مکمل صورتِ حال کا بھی اندازہ نہیں تھا کہ مجھے عدالت اور سیکرٹ سروس کے بے رحم چنگل سے چھڑوا کر لانے والی کون سی قوتیں ہیں۔ ایک بات تو بالکل واضح تھی کہ پاکستان میری خاطر خوب سفارت کاری کی تھی جسکا مجھے بہت فائدہ ہوا تھا۔ مگر اگلی کوئی بھی چال چلنے یا قدم اٹھانے سے پہلے مجھے خوب اچھی طرح سے صورت حال کا علم ہونا ضروری تھا۔ میں سیدھا جاکر اپنے بستر پر لیٹ گیا، کھانے کے بعد نیند کا غلبہ بھی آہستہ آہستہ طاری ہونے لگا۔ مگر اس سے قبل کہ میں سونے کا ارادہ کرتا کمرے میں موجود انٹر کام پر بیل ہوئی تو میں نے ہاتھ بڑھا کر رسیور اٹھالیا۔

" ہیلو۔۔۔"

" سر کیا آپ بر آئن مور بات کر رہے ہیں۔۔۔" دوسری طرف سے ایک مترنم سے نسوانی آواز میرے کانوں میں پڑی۔

" ہاں جی میں ہی بات کر رہا ہوں۔۔۔ فرمایئے؟"

" سر میں فاطمہ سحر بات کر رہی ہوں انفو ڈیسک سے۔ ڈسٹرب کرنے کی معذرت چاہتی ہوں۔۔"

"جی نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔۔۔ ہاں جی بولیئے؟"

" سر آپکے لئے ایک اطلاع یہ ہے کہ اب سے ایک گھنٹے کے بعد آپ سے ملنے کے لئے اٹارنی جنرل صاحب اور

توقیر رضوی صاحب آرہے ہیں۔ آپ سے گزارش ہے کہ آپ ایک گھنٹے کے بعد میٹنگ روم میں تشریف لے جائیے گا، وہیں آپکی ملاقات ان سے ہوگی۔۔۔"

"جی بہت بہتر میں ایسا ہی کرونگا۔۔۔ آپ کا بے حد شکریہ۔۔"

"سر اپنا ڈھیر سارا خیال رکھیئے گا۔۔۔ آپ کو کسی بھی قسم کی کوئی پریشانی یا تکلیف ہو تو آپ اپنے انٹرکام سے ون زیرو زیرہ ڈائل کر دیجئے گا۔ آپکا مسئلہ دور کرنے کی پوری پوری کوشش کی جائے گی شکریہ۔۔۔" یہ کہتے ہی دوسری طرف سے لائن ڈراپ ہوگئی۔ مجھے جو تھوڑی بہت نیند کے ہچکولے آرہے تھے وہ بھی رفو چکر ہوگئے اور اب میں بے صبری سے پانچ بجنے کا ویٹ کرنے لگا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

ٹھیک پانچ بجے کا وقت تھا اور میں توقیر رضوی صاحب سے پہلی بار تنہائی میں ملا۔ انہوں نے خوب محبت اور شفقت کا اظہار کیا۔ وہ پاکستان کے بے حد ممنون تھے۔ بقول انکے یہ سب پاکستان کے سفارت خانے نے سفارتی سطح پر ایران سے رابطہ کروا کر کرایا تھا۔ سفارت کار اگر متحرک ہوجائیں تو کام یوں ہی اجلت میں ہوا کرتے ہیں۔ انہوں نے مجھے کہا کہ کل تمہیں رہائی ملتے ہی ایک خفیہ چارٹرڈ طیارے میں یہاں سے دبئ اور پھر دبئ سے سیدھا امریکہ پہچایا جائے گا۔ انہیں اس بات کا باخوبی علم تھا کہ میں غیر سرکاری مشن پر امریکی ایجنٹ بنا ہوا ہوں۔ مگر بدقسمتی سے ایران میں سیکرٹ سروس کی اندرونی ناچاکی کی نظر ہوگیا۔

اگلی صبح واقعی وہی ہوا جسکی پہلے ہی پیشین گوئی کی جا چکی تھی۔ آمنہ جہاں نے حیرت انگیز طور پر اپنے تمام جرائم نہ صرف قبول کرلیا اور اپنی ذہنی علالت کا بھی اقرار کرلیا۔ تمام مصیبتیں ٹل گئیں تھیں۔ عدالت نے مجھے رہائی کا حکم دے دیا۔ میں جیسے ہی رہا ہوا۔ سفارتی عملے نے مجھے اپنی تحویل میں لیکر ایک چارٹرڈ طیارے پر روانہ کردیا۔ یوں میرا ایران کا ایک سنسنی خیز باب اپنے منطقی انجام کو پہنچ گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

قارئین کی فرمائش پر میں اپنی داستان کو مختصر کر کے اسی قسط میں ختم کر رہا ہوں۔ میری داستان چونکہ بہت طویل ہے اور اگر میں اسے ایک ایک کر کے سنانے بیٹھوں تو کئی سالوں بعد ختم ہونی تھی۔ لہٰذا اب میں اپنے واقعات اختصار کے

ساتھ پیش کر کے اسے اسی قسط میں ختم کر رہا ہوں تاکہ قارئین کی خواہش کو پورا کیا جاسکے۔

مایانے جو مجھے پر اسرار گفٹ باکس دیکھا تھا۔ اس میں ایک نقشہ اور ایک مختصر تحریر تھی۔ جس میں ایک افریقہ کے جنگل کا ذکر تھا۔ جہاں پر ایک قدیم مندر کے تہہ خانے میں اس نے دنیا کا سب سے قیمتی اور بھاری ہیرا دفن کر رکھا تھا۔ اس کے بقول اگر میں وہ اسے پالیتا ہوں تو میری سات نسلیں آرام سے زندگی گزار سکتی ہیں۔ بلاشبہ یہ ایک بہترین آفر تھی مگر میں جس طرح ڈیوٹی پر طرح میں یہ سب افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔ مایانے مزید بتایا کہ کیپٹن جیک دی ونڈر فل کی موت ہو چکی تھی۔ مگر جاتے جاتے وہ مجھے اپنی سب سے قیمتی چیز دے کر گیا تھا۔ مجھے اس کی موت کا شدید افسوس ہوا۔ مگر میں افسوس کے علاوہ کچھ مزید کر بھی نہیں سکتا تھا۔

مجھے ریکوری میں چھ ماہ لگ گئے۔ اس دوران امریکہ نے افغانستان پر حملہ کر دیا۔ کرنل اشر کی بلیک ڈائمنڈ ایجنسی نے امریکہ کی خوب مدد کی تاکہ افغانستان میں خوب خون کی ہولی کھیلی جاسکے۔ یہ اسی پلاننگ کا حصہ تھا کہ اب جلد ہی عراق میں یہ سب کھیل کھیلنے کی تیاری ہو رہی تھی۔

جوں ہی میری ریکوری ہوئی تو ایک رات کرنل اشر مجھے اپنے ساتھ ایک خفیہ جزیرے پر لے گیا۔ وہاں جا کر میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی اور مجھے ایک آبدوز کے ذریعے شیطان کے دربار میں پہنچا دیا گیا۔ وہ ہفتے کی درمیانی شب تھی۔ جب میری آنکھوں سے پٹی ہٹائی گئی تو مجھے یہ دیکھ کر بہت حیرت ہوئی کہ وہاں سرخ روشنی ایک ہال میں ہر سو پھیلی ہوئی تھی۔ کچھ لوگ سیاہ لباس میں ملبوس تھے۔ مجھے بھی ان جیسا لباس پہنایا گیا۔ اور پھر ہال میں ایک دم اندھیرا ہو گیا۔ جوں ہی روشنی آئی تو کیا دیکھتا ہوں کہ ہال کا پورا منظر ہی تبدیل ہو چکا تھا۔ سامنے ایک عجیب و غریب خلقت موجود تھی۔ ایک بکری جسکی چھاتی عورت کی مانند اور باقی جسم مرد کی مانند تھا وہاں موجود تھی۔ اس کی شکل نہایت کریہہ تھی اور وہاں ہر سو بدبو پھیل گئی تھی اور سب لوگ اس کے سامنے نہایت احترام سے سر جھکا کر کھڑے تھے۔ وہ حیرت انگیز منظر میری نظروں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ اس شیطان سے تیز روشنیاں پھوٹ رہی تھیں۔

ایسے میں چند افراد اپنے سروں پر غلاف اوڑھے ہال میں داخل ہوئے اور پھر اس کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ پھر اس کے بعد چند اور لوگ اپنے کندھے پر ایک نوجوان کو لے کر آئے اور خاموشی کے ساتھ انہوں نے اس کے سامنے اسکے قدموں میں پھینک دیا۔ پھر ایک نے اپنے ایک ہاتھ سے بڑا ہتھوڑا اٹھایا اور اسکے سر پر رکھ کر دے مارا۔ اس ہتھوڑے کے بعد ایک بڑے چاقو سے اس کو ذبح کر کے شیطان کے سامنے اسکی بلی پیش کی گئی۔ کچھ خون شیطان کے جسم پر چھڑکا گیا اور باقی ایک سے تھال میں منتقل کر کے باقی لوگوں کے پاس لے جایا گیا۔ سب لوگ تھالی کو منہ لگاتے اور اسے

تبرک کے طور دو دو گھونٹ پیتے جاتے۔جو وہ تھالی میرے سامنے آئی تو مجھے بھی دل پر پتھر رکھ کر اسے پہناپڑا۔اس کا ذائقہ نہایت برا تھا۔مگر سب لوگ ذوق وشوق سے اسے پی رہے تھے۔کچھ ہی دیر میں سب لوگ شیطان کے سامنے سجدے میں گھر گئے۔ بجلی ایک بار پھر غائب ہوئی اور شیطان غائب ہو گیا۔میری آنکھوں پر پٹیاں باندھی گئیں اور پھر اسی عمل کے ذریعے میں آبدوز سے واپس سطح سمندر پر آکر اسی جزیرے پر آکر میری پٹیاں کھول دی گئیں۔اس پورے عمل میں کرنل اشر میرے ساتھ نہیں تھا۔مگر میں جیسے ہی واپس اس کے پاس پہنچا تو اس نے مجھ پر ایک اور چونکادینے والاانکشاف کیا کہ مبارک ہو میں ابھی شیطان کے دربار سے ہو کر آیاہوں۔اور یہ برمودا ٹرائی اینگل کے اندر موجود ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

2003ء میں مجھے جنگ سے قبل عراق بھجوایا گیا۔وہاں جاکر مجھے کیمیکل سعد علی سے ملنا تھا۔وہ ایٹمی ہتھیار بنانے میں مہارت رکھتا تھااور صدام حسین کی حکومت کا ایک سب سے اہم رکن تھا۔مجھے یہ معلوم کرنا تھاکہ آیاعراق میں کیمیائی ہتھیار ہیں یا نہیں۔تو کیمیکل سعد علی نے مجھے یقین دہانی کروائی کہ ایسا کچھ نہیں۔انہوں نے وہ کیمیائی ہتھیار ایران جنگ کے لئے بنائے تھے۔ البتہ اب انکا کہیں کوئی وجود نہیں۔ کیونکہ عراق کو ان کیمیائی ہتھیاروں کا کوئی فائدہ نہیں بلکہ نقصان زیادہ ہوا تھا۔مگر مجھے کرنل اشر کی طرف سے سخت حکم ملاہوا تھاکہ مجھے ہر حال میں یہ رپورٹ دینی ہے کہ عراق کے پاس کیمیائی ہتھیار موجود ہیں۔لہذا مجھے مجبوراً وہی رپورٹ تیار کرنا پڑی۔ہاں جنم کے سوداگروں کے اس خونی کھیل کا میں خود بھی حصہ تھااور لاکھوں انسانوں کا خون صرف میری غلط رپورٹنگ کی وجہ سے ہوا تھا۔کچھ ہی عرصے میں ہم نے دیکھا کہ امریکہ نے وہاں ابوغریب جیل میں ظلم وبربریت کی انتہا کردی۔اتنا ظلم کیاکے انسانیت شرما جائے۔جی ہاں اس کا اکلوتا مجرم میں خود ہوں اور میں آج بھی اس بات پر شرمندہ ہوں۔

میرا اگلا مشن لیبیا تھا۔معمر قزافی کی حکومت کا تختہ نہ صرف الٹنا تھابلکہ اسے نشان عبرت بنانا تھا۔میں نے وہاں جاکر باغیوں کے سرغنہ کو لیبیاکی حکومت کی خلاف اکسایا۔معمر قزافی سے بیشتر لوگ خوش تھے۔مگر جب امریکہ کام کرتا ہے تو پھر ایساہی ہوتا ہے۔ میں نے انہیں خفیہ طور پر ہتھیار منتقل کئے۔باغی آپے سے باہر ہوگئے۔انہیں ہر صورت میں معمر قزافی کی خوفناک موت چاہیے تھی۔آگ لگ چکی تھی بس اب جلتی پر تیل ڈالنا تھا۔معمر قزافی کسی بھی طرح سے اقتدار چھوڑنے کو تیار نہیں تھا۔سو مجبوراًاقوام متحدہ کو درمیان میں ڈال عالمی فوجیوں کو باغیوں کے روپ میں میں نے جی ہاں میں نے لیبیاپر چڑھ دوڑنے کے لئے ہر ممکن مدد کی۔سو وہی ہوا۔لیبیاکھنڈر بن گیا۔معمر قزافی کو عبرت ناک انجام سے دوچار کیا۔

اس حکومت کا تختہ الٹنے اور بھرپور شکست کے بعد اب اگلا مرحلہ مشرق وسطیٰ کا پورا نقشہ تبدیل کرنا تھا۔ تاکہ مسلمان ممالک کو کمزور کر کے اسرائیل کے گھٹنوں پر لایا جاسکے۔ مجھے مڈل ایسٹ کے دس ممالک کا انتخاب کر کے کرنل اشر نے ٹاسک دیا کہ اگلے تین سالوں کے اندر ان سب کی حکومتوں چلتا کرنا ہے۔ شیطان کا یہی حکم ہے۔ سو مجبوراً شیطان کا حکم ماننا پڑا۔ مگر اس موقعے پر میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ یہ آخری مار کہ ہو گا اور میں اسکے بعد اس شیطان مردود اسکے سب سے بڑے چیلے کرنل اشر کی گردن اپنے ہاتھوں سے مسلوں گا۔ تاکہ اس سلسلے کو ہمیشہ کے لئے اپنے انجام تک پہنچایا جاسکے۔

پلان کے عین مطابق میں نے ان دس ممالک میں باری باری جاکر باغیوں کو اپنی اپنی حکومتوں کے خلاف کھڑا کیا۔ دس میں پانچ ممالک نے اپنے آپ کو قابو میں رکھا اور حالات کو کنٹرول سے باہر نہیں ہونے دیا۔ البتہ چار ممالک کے تختے اگلے دو سالوں میں الٹ دیئے گئے۔ یہ ایسا گھناونہ کھیل تھا کہ خدا کی پناہ۔ واقعی جب خون منہ کو لگ جائے تو اس کا انجام بہت برا ہوتا ہے۔ آدمی انسان سے درندہ بن جاتا ہے اور پھر ہر حد پار کر جاتا ہے۔

میں پانچ ممالک میں کامیاب رہا۔ البتہ شام میں آکر میں نے آخری لمحے میں روس کو امریکہ کے سارے راز بیچ دیا۔ شام نے روس سے باغیوں کے خلاف مدد مانگی تو وہ اپنے جنگی طیارے لیکر شام کے ان باغیوں پر چڑھ دوڑا جسے امریکہ نے کھڑا کیا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

ختم شُد

اس ناول پر آپکی قیمتی رائے کا انتظار رہے گا۔